© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اکبر کے دینِ الٰہی کے بعد دوسری تحریک جس میں مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کو خالص الحاد کی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی وہ آتاترک کی نام نہاد اصلاحی تحریک تھی۔ اس تحریک میں اس امر کا پورا پورا اہتمام کیا گیا کہ ملتِ اسلامیہ کی دینی وحدت کو پارہ پارہ کیا جائے اور مختلف ممالک میں جو مسلمان پھیلے ہوئے ہیں ان کے اندر نیشنلزم کے احساسات ابھار کر انہیں خاکِ وطن کی خاطر جینا اور مرنا سکھایا جائے۔ مسلمانوں کے ملی مراکز جہاں سے انہیں ہر وقت خدا اور اس کے رسول کا پیغام ملتا ہے، انہیں یا تو منہدم کر دیا گیا یا پھر ان کی جگہ میوزیم اور مدارس قائم کیے گئے۔ اسلامی قوانین کو یکسر منسوخ کر کے اُن کی جگہ فرانسیسی کوڈ اور جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے قوانین جاری ہوئے۔ ترکوں کو اپنے ماضی اور اس کی عظیم الشان روایات سے بیگانہ کرنے کے لیے عربی رسم الخط کو بدل دیا گیا۔ حتیٰ کہ عربی میں اذان اور نماز تک بھی ممنوع قرار پائیں۔ مختصراً اس انقلاب کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی تہذیب اور تمدن کو یکسر مٹا کر یہاں مغربی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیا جائے تاکہ یہ ملک یورپ کے رنگ میں پوری طرح رنگ جائے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ دنیا کے سارے اسلامی ممالک میں اگر کسی ملک میں مغربی تہذیب کے لیے فضا کسی حد تک سازگار ہو سکتی تھی تو وہ صرف ترکی ہی تھا۔ یہ ملک یورپ سے بالکل ملحق ہے اس لیے یورپ کے اثرات اس میں بڑی آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سرزمین میں مغربی تہذیب کا علم اُس شخص نے بلند کیا جسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی حد تک ترکوں کا نجات دہندہ کہا جا سکتا ہے جو مغربی استعمار کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑا اور ملک کی آزادی کے لیے بے مثال ایثار او قربانی پیش کی۔ پھر ترکی میں مغربی تہذیب نے اس وقت قدم رکھا جو اس کے عروج کا زمانہ تھا۔ مغربی تمدن کے علمبردار اپنے اندر نئے نئے عزائم اور ولولے رکھتے تھے۔ خود اس تمدن کی خامیاں پوری طرح نمودار نہ ہوئی تھیں اس لیے ترکوں کا مغربی افکار و نظریات سے مرعوب و مغلوب ہو جانا بالکل فطری امر تھا۔

اس تحریک کو ملک میں کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی اُس کا ایک ہلکا سا اندازہ اُن اخبارات و رسائل کی اطلاعات سے کیا جا سکتا ہے جو مغربی اقدار کے سب سے بڑے حامی ہیں اور انہیں دنیا میں کامیاب و کامران دیکھنے کے نہ صرف آرزومند ہیں بلکہ اس راہ میں جدوجہد بھی کر رہے ہیں۔ تین ماہ قبل مشہور رسالہ ٹائمز میں اسی موضوع پر ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا جس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

"مذہب" کا احیاء دوسرے ممالک میں ممکن ہے کہ ایک علمی بحث کا موضوع ہو لیکن ترکی میں یہ صورتِ حال ہرگز نہیں۔ یہاں اس کی سیاسی اہمیت ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب کمال اتاترک نے ترکی میں انقلاب کی بنیاد رکھی تو اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو اجتماعی زندگی سے خارج کر کے اسے غیر مذہبی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اس لیے ترکی میں اسلام کا احیاء بڑے دُور رس نتائج کا حامل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اتاترک نے ملک کی ترقی کے لیے جو اصلاحات تجویز کی تھیں یا جو منصوبے تیار کیے تھے وہ دریا برد کر دیئے جائیں۔ یہ تمثیل اگرچہ مقصد کو پوری طرح واضح نہیں کرتی لیکن اس وقت مذہب کو زندہ کرنے کے لیے ترکی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نوعیت کے اعتبار سے انگلستان کی اُس تحریک کی طرح ہوگا جو پارلیمنٹ کی برتری کے بجائے بادشاہ کی برتری کو بحال کرنے کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شروع کی جائے۔ اتاترک کو اپنے عزائم میں جو کامیابی نصیب ہوئی اس میں اُس کے ذاتی اثر رسوخ اور ترکی قومیت کے جوش و ولولہ کا بڑا عمل دخل تھا اور ان دونوں چیزوں نے مذہب کو وقتی طور پر شکست دے دی، لیکن جونہی اتاترک نظروں سے اوجھل ہوا اُسی وقت مذہب کا احیاء شروع ہوا۔ آج پھر ابتدائی اور ثانوی سکولوں میں مذہبی تعلیم لازمی ہوگئی ہے۔ ریڈیو پر قرآن مجید کی باقاعدہ تلاوت ہوتی ہے۔ ائمہ کی تعلیم کے لیے جگہ جگہ مدارس کھولے جارہے ہیں۔ انقرہ یونیورسٹی میں دینیات کا شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ مذہبی کتب جو اتاترک کے عہد میں بالکل ناپید تھیں اب بڑی تیزی کے ساتھ شائع کی جارہی ہیں۔ رمضان کے مہینے میں مسجدوں میں بے حد رونق ہوتی ہے۔ انقرہ کے عین وسط میں ایک اسلامی مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے جس میں ایک عظیم الشان مسجد، ایک بہت بڑا مدرسہ اور ایک وسیع دار المطالعہ قائم کیے جائیں گے۔ اس مرکز کے علاوہ ۱۹۵۰ء سے آج تک ترکی میں پانچ ہزار نئی مساجد تعمیر ہوئی ہیں ان میں پچاس صرف انقرہ میں ہیں۔ حکومت ان مساجد کو جو امداد دے رہی ہے اُس کا پوری طرح اندازہ نہیں کیا جاسکتا مگر ایک بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ اچھی خاصی رقم ہے۔ ائمہ کی تعلیم و تربیت کے لیے جو مدارس قائم ہوتے ہیں اُن کی تعداد میں بھی بڑی سرعت کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں اس قسم کے مدارس صرف سات تھے اور اب اُن کی تعداد انیس تک پہنچ گئی ہے۔ ان مدارس سے ہر سال ساڑھے چار ہزار نوجوان فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔ ان اداروں میں زیادہ تر عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔

مغربی اقوام میں ترکوں کی اس مذہبی بیداری کا جو ردِ عمل ہو رہا ہے اُس کو بھی ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"بہت سے ترک مفکرین اس صورتِ حال پر سخت پریشان ہیں۔ پارلیمنٹ میں اس موضوع پر جو مباحثے ہوتے ہیں اُس میں حزبِ اختلاف نے برسرِ اقتدار پارٹی پر ہمیشہ مذہب کی حمایت اور تعاون کا الزام لگایا ہے۔ موجودہ حکومت کے قیام کے بعد تمام وہ مذہبی عناصر جو اتاترک کے عہد میں غائب ہو گئے تھے اب پھر نمودار ہو رہے ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں لطف کی بات یہ ہے کہ یہ حزبِ اختلاف جو اتاترک کی اصلاحات پر دل وجان سے فریفتہ ہے وہ بھی مذہب کی کھل کر مخالفت نہیں کر سکتی کیونکہ اسے اس بات کا پورا یقین ہے کہ ایسا کرنے سے آنے والے انتخابات میں وہ زیادہ ووٹ حاصل نہیں کر سکیگی۔ ترکی جمہوریہ ہے اور عوام مذہب کا احیاء چاہتے ہیں۔ اتاترک نے لوگوں کی رہنمائی کی تھی لیکن آج عوام اپنے سربراہوں کی قیادت فرما رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتاترک کی اصلاحات کو ابھی تک پوری طرح کالعدم نہیں کیا گیا لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں اتاترک کو قومی ہیرو مانا جاتا ہے اور جس کی تعریف و توصیف میں لوگ رطب اللسان ہوں وہاں مذہب کا احیا بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

کیا اتاترک کے پیشِ نظر صرف ریاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ کرنا تھا یا اس کے سامنے اس سے بلند تر کوئی مقصد موجود تھا یعنی مذہب کا خاتمہ۔ اگرچہ اب یہ بات کہنا ایک فیشن سا بن گیا ہے کہ اتاترک مذہب کا مخالف نہیں تھا لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ ترکی کا یہ ہیرو اس بات پر پختہ یقین رکھتا تھا کہ ترکوں کو اُس وقت تک مغربی اقدار کا پوری طرح پرستار نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ اسلام کی گرفت اُن پر سے ڈھیلی نہ ہو جاتے۔" (ڈائمز)

ترکی میں جو فوجی انقلاب ہوا ہے اُس کے بارے میں مغربی حلقوں میں جس مسرت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شادمانی کا اظہار کیا جا رہا ہے اُس کی وجہ یہ نہیں کہ اہلِ مغرب یہ سمجھتے ہیں کہ ترکی میں اس انقلاب سے ایک مضبوط قومی حکومت کا قیام ممکن ہو گا اور یہ حکومت جمہوریت کو ملک میں بحال کرنے میں زیادہ کامیاب ہو گی بلکہ اس خوشی کی اصل وجہ یہی ہے کہ اسلام کے احیاء کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں انہیں اب زیادہ قوت سے دبایا جا سکے گا۔ ٹائمز نے اس انقلاب پر جو تاثر بیان کیا ہے وہ گہرے غور و فکر کا محتاج ہے:

"ترکی کسی انقلاب کی آغوش میں نہیں۔ انقلاب تو اس پر ۳۰ سال پیشتر اتاترک کے عہد میں آ چکا تھا۔ فوج اس وقت جو کچھ کر رہی ہے وہ صرف یہ کہ عدنان مندریس کے دورِ اقتدار میں اسلام کا جو احیاء ہوا ہے اور اس طرح قوم اتاترک کے بتلائے ہوئے اصولوں سے جس حد تک ہٹی ہے اُسے اُن کی طرف پھر لوٹا دیا جائے۔ ترکی میں آج بھی ایک ہی لیڈر ہے یعنی اتاترک، اور اس حقیقت کو فوجی انقلاب کے سب سے بڑے سربراہ نے اس بیان میں تسلیم کیا ہے جس میں اُس نے نہایت واضح الفاظ میں یہ کہا ہے کہ نئے دستور میں جسے یونیورسٹی کے اساتذہ ترتیب دے رہے ہیں ایک دفعہ یہ بھی ہو گی کہ مذہب کو سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔"

ٹائمز کے اس نقطۂ نظر کی مشہور اخبار آبزرور نے بھی تائید کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"حریت پسند ترک اس بات سے خائف تھے کہ ملک میں مذہبی بیداری عام ہو رہی ہے۔ مندریس کیا بذاتِ خود کوئی مذہبی آدمی ہے یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ہمارے لیے جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ترکوں کی اکثریت کے لیے جو ابھی تک اسلام سے وابستہ ہے۔ عدنان اور اُس کے رفقاء اسلام کے حامی اور علمبردار تھے اور عصمت انونو اور اُس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پارٹی اتاترک کے فدائی۔

ممکن ہے ایک سطح بیں آنکھ کے لیے اکبر کے دینِ الٰہی اور اتاترک کی اصلاحات کے خلاف جو ردِ عمل ہوتا ہے وہ کوئی اتفاقی حادثہ ہو لیکن وہ شخص جس نے ان حالات و واقعات پر ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا ہے وہ اسے کبھی بھی بخت و اتفاق سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ ان اسلام دشمن تحریکات کی اپنی فطرت اور اپنے مزاج میں تباہی و بربادی کے پورے پورے سامان موجود تھے۔ تاریخ نے اُن کے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے وہ بالکل صحیح اور قانونِ قدرت کے عین مطابق ہے۔ یہ تحریکات وقتی اور ہنگامی حالات کے تحت ابھری تھیں۔ ان کے پیش نظر صرف وقتی مسائل تھے، مگر بدقسمتی سے ان تحریکات کے علمبرداروں نے انہیں مستقل اور پائیدار سمجھا اور جب یہ دیکھا کہ ان کا مزاج اسلام سے میل نہیں کھاتا تو دین کے اندر تحریف شروع کر دی۔ کچھ وقت کے لیے تو یہ جادو چل گیا، لیکن تھوڑی مدت گزرنے کے بعد جب حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آئی تو پھر لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور انہیں معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ برسرِ اقتدار گروہ نے نہایت شرمناک کھیل کھیلا ہے۔ اس احساس کے بعد اُن میں ردِ عمل کا پیدا ہو جانا بالکل فطری امر تھا۔

ان صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ اس موضوع پر کوئی تفصیلی بحث کی جائے۔ یہاں اس حقیقت کو صرف ایک مثال سے واضح کیا جاتا ہے۔ ایک ان پڑھ سے ان پڑھ مسلمان بھی اسلامی قومیت کے بارے میں اس قدر تو ضرور جانتا ہے کہ اسلام میں قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی۔ بلکہ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اُس وسیع برادری میں جو جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات

© rasailojaraid.com

کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں ملی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خاک و خون کے رشتے ایک مسلمان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے یا وہ ان علائق کا دشمن ہے بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ وابستہ اور جوڑنے والی چیز وطن یا برادری نہیں بلکہ دین ہے اور دین ہی اس کے اندر زندہ رہنے کی تڑپ اور بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے احساسات پیدا کرتا ہے اور یہ چیز ایک مسلمان کے دل و دماغ میں پوری طرح جاگزیں ہو چکی ہے۔

اتاترک نے جس وقت ہوش سنبھالا اُس وقت چونکہ نیشنلزم کا زور تھا اس لیے اس نے یہ سمجھا کہ ترکوں کی نجات کا واحد راستہ بھی اسی مسلک کی پیروی میں ہے۔ اس نے وقتی جوش میں آکر خلافت کی قبا چاک کر دی اور قومیت کی بنیاد وطن کو قرار دیا۔ چونکہ یہ نظریہ اسلام کے مزاج کے یکسر منافی ہے اس بنا پر اس "ترکِ ناداں" کو اسلام سے بغاوت کرنا پڑی۔ کچھ لوگ جن کی نگاہیں وقتی مسائل کے خم و پیچ میں ہمیشہ الجھی رہتی ہیں اور جو کسی مسئلہ کو بالغ نظری سے دیکھنے کے عادی نہیں ہوتے انہوں نے اس اقدام پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ مغربی حلقوں میں بھی اس تبدیلی کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم ہوا کہ چلو اسلامی برادری سے ایک قوم تو کٹی۔ لیکن اس انقلاب پر ابھی چند سال ہی گزرے تھے کہ خود یورپ کے اندر اس نیشنلزم کے خلاف بغاوت کا جذبہ نمودار ہونے لگا۔ زمان و مکان کی تسخیر نے دنیا کے مختلف گوشوں کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ اب انہیں محض وطن کی بنیاد پر زندہ رہنا مشکل نظر آتا ہے۔ اس صورتِ حال کے بدل جانے سے ترکوں کے اندر بالکل قدرتی طور پر یہ احساس پرورش پانے لگا ہے کہ ان کے رہنما جنہوں نے انہیں امتِ مسلمہ سے الگ کیا ہے کوئی صاحبِ نظر اور عاقبت اندیش لوگ نہ تھے بلکہ بڑے کم نظر تھے جنہوں نے انہیں بڑے غلط راستے پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈال دیا۔ جب لوگوں کے اندر یہ احساس بڑھنے لگے تو لازمی طور پر اُن میں رہنماؤں کے متعلق ایک عام بے اعتمادی سی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ملت کے ان "خیر خواہوں" کے سارے کارناموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ترکی میں بھی یہی کچھ ہوا۔ اتاترک نے ترکوں کے اندر نیشنلزم کے احساسات اُبھار کر ایک اتنی بڑی حماقت کی ہے کہ مسلمان تو کیا غیر مسلموں نے بھی اُس کی اس ناعاقبت اندیشانہ روش پر نفرین کہی ہے۔ اس سلسلہ میں فلسفۂ تاریخ کے مشہور مفکر پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی کے تاثرات پڑھنے کے قابل ہیں۔ وہ اپنی تصنیف "دنیا اور مغرب" کے دوسرے باب میں اتاترک کی اس حماقت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ترک اور بہت سی دوسری مسلمان قوموں نے نیشنلزم کو اپنایا ہے۔ اس مرحلہ پر ہم اپنے آپ سے ایک سوال کرتے ہیں کہ مغرب کے اس تنگ دلانہ اور متعصبانہ نقطۂ نظر کو جب ایک ایسی وسیع المشرب قوم اختیار کرے جس کی قومی روایات نے اسے یہ سبق دیا ہے کہ مسلمان خواہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، خواہ کوئی زبان بولتا ہو، خواہ کسی خطۂ ارضی میں آباد ہو وہ ایک دوسرے کا بھائی ہے، تو اس کا حشر کیا ہوگا۔ اس جدید دور میں جس میں سائنس کے انکشافات نے زمان و مکان کے فرق کو قریب قریب مٹا دیا ہے، جس میں اب مغربی تصورات اور اشتراکی نظریات ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں اور رنگ و نسل یا زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض آئیڈیالوجی کی اساس پر قومیتوں کی تشکیل کی جا رہی ہے، اسلام کا نظریۂ اخوت اور اس کی روایات عہدِ حاضر کے تمدنی تقاضوں کو مغربی قومیتوں کی بہ نسبت بہتر طور پر پورا کر سکتی ہیں۔ نئے حالات میں جس میں دنیائے مغرب چالیس چھوٹی چھوٹی آزاد قوموں میں منقسم ہے اس بات کا ہر وقت خدشہ موجود رہتا ہے کہ کہیں یہ آپس میں لڑ کر ختم نہ ہو جائیں۔ یہ بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ دنیائے اسلام میں مغرب کا لایا ہوا قوم پرستی کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہ حیثیت اسلامی روایات کی قوت وطاقت سے ختم ہو جائے گا یا کم از کم بڑھنے نہ پائے گا۔ اس ایٹمی دور میں انسانیت کی نجات کے لیے انسانی اتحاد جتنا آج ضروری ہے اس سے پیشتر کبھی اس کی ضرورت اتنی شدت سے محسوس نہ ہوتی تھی۔"

پروفیسر صاحب نے بڑی صراحت کے ساتھ یہ کہا ہے کہ دوسرے مسلمان ممالک اگر ترکی کی پیروی کریں گے تو خود اپنی تباہی و بربادی کا موجب بنیں گے۔ انہوں نے اہلِ پاکستان کو اس حرکت پر سخت متنبہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"آپ اہلِ پاکستان کو ایک قومی ریاست میں پورا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ ان کی یہ ریاست بڑی وسیع وعریض ہے اور بہت زیادہ گنجان آباد، ہندوستانی مسلمانوں کو آزادی کی قیمت ترکوں اور مصریوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ادا کرنی پڑی۔ تجربے اور مشاہدے نے انہیں مغربی نیشنلزم کی قیمت اور اس کے عیوب سے پوری طرح آشنا کر دیا ہے۔ پاکستان اور ترکی کے رہنے والے سیاسی میدان میں اب ایسے سبق حاصل کر رہے ہیں جو نہ صرف مسلمانوں کے لیے مفید اور کارآمد ہوں گے بلکہ ایک دنیا ان سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے گی۔"

اقتباسات ذرا طویل ہو گئے ہیں لیکن ان میں فاضل مصنف نے بڑی دیدہ وری سے مسلم قوم کی اس حماقت کا جائزہ لیا ہے جو اس نے مغربی نیشنلزم کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں کی ہے۔ یہ احساسات اُس شخص کے ہیں جو مغرب کا پرستار ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم جس کی اپنی تہذیب ہو، جو اپنی روایات رکھتی ہو، جو ایک متعین اسلوبِ حیات کی علمبردار ہو اور جو انفرادی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجتماعی زندگی میں اپنی مستقل اقتدار رکھنے کا دعوےٰ کرے وہ دوسری اقوام کی نقالی کر کے کبھی بھی دنیا میں پنپ نہیں سکتی۔ وہ ایک ایک قدم پر ٹھوکر کھاتی ہے اور ہر گام پر حادثات کا شکار ہوتی ہے۔ اس کے اندر نہ صرف یاس و قنوطیت کے جراثیم پرورش پاتے ہیں۔ بلکہ اپنے آپ پر اعتماد بھی ختم ہو جاتا ہے۔

مصر ہو یا ایران، ٹرکی ہو یا پاکستان، ٹیونس ہو یا انڈونیشیا، ان سب کو اس وقت ایک ہی مسئلہ درپیش ہے کہ ان کے ہاں ایک مختصر سا طبقہ جسے بدقسمتی سے سیاسی اقتدار بھی حاصل ہے، وہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو مغرب پرستی کی راہ پر ڈالنا چاہتا ہے لیکن قوم اس پر آمادہ نہیں ہوتی۔ برسرِ اقتدار گروہ جبر سے، قوت و طاقت سے اسے چند قدم ہانکتا ہے لیکن جلد ہی جب قوم کو اس راہ کے خطرات نظر آنے شروع ہوتے ہیں تو وہ برگشتہ ہو کر اپنی اصل منزل کی طرف لوٹنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ یہ مغرب زدہ طبقہ پولیس اور فوج کی مدد سے اس کا راستہ روکتا ہے اور اس طرح آپس ہی میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کی قوتیں اور صلاحیتیں کسی تعمیری اور مثبت کام پر صرف ہونے کی بجائے باہمی آویزش میں صرف ہو رہی ہیں۔ ہمارے نزدیک ملتِ بیضا کا اصلی روگ یہی ہے اور جب تک اس کا پوری طرح علاج نہیں کیا جاتا وہ ایک قدم بھی آگے کی طرف نہیں اٹھا سکتی۔

اس مقام پر ہم اس امر کی صراحت کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ مغرب زدہ طبقہ اسلام کے خلاف کھلم کھلا کارروائی نہیں کرتا بلکہ اسلام کو مٹانے کے لیے جو سازشیں بھی کی جاتی ہیں وہ سب اسلام کے نام پر ہی ہوتی ہیں اور اسی طریقہ کو تجربہ سے زیادہ مفید اور کارآمد پایا گیا ہے۔ یہ طبقہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں، اپنے آپ کو اسلام کا سچا فدائی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور خیر خواہ ظاہر کرتا ہے لیکن جس اسلام کی محبت کا وہ اس قدر دم بھرتا ہے اُس کی جھلک نہ تو خود اُس کی اپنی زندگی کے کسی گوشے میں نظر آتی ہے اور نہ ہی اجتماعی زندگی کے لیے جو منصوبے تیار کیے جاتے ہیں اُن میں اس کا کوئی نام و نشان ملتا ہے۔ یہ صورت حال قومی زندگی کے لیے حد درجہ خطرناک ہے۔ اس سے قوم کے اندر ذہنی خلفشار پیدا ہوتا ہے جس سے آہستہ آہستہ اُس کی ساری قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ لوگ اسلام سے کھل کر انحراف کریں تو معاملہ اتنا پیچیدہ اور تشویشناک نہ ہو لیکن ان حضرات کا یہ طرزِ عمل امتِ مسلمہ کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت بن گیا ہے۔

آپ کسی اسلامی ملک کے برسرِ اقتدار طبقے کے اقوال اور افکار و اعمال کا جائزہ لیں تو آپ کو اس ذہنی انتشار کے بڑے نادر سے نادر نمونے ملیں گے۔ ایک طرف اسلام کی مدح ستائش ہو رہی ہوگی، اُسے دنیاوی اور اُخروی زندگی کے لیے واحد ذریعۂ نجات بتایا جا رہا ہوگا لیکن دوسری طرف اسلام جن چیزوں کو دنیا سے مٹانے کے لیے آیا ہے، اُن کی بھی دل و جان سے تائید ہوتی ہوگی۔ اور معاملہ صرف لفظی تائید تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ ملک میں انہیں فروغ دینے کے لیے ہر ممکن کوشش بھی ہوتی ہے۔ کونسا ایسا مسلمان ہے جو اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ اسلام نے رقص و سرود کو حرام ٹھہرایا ہے اور یہ چیزیں اسلام کے مزاج کے منافی ہیں۔ جو لوگ ان کے رسیا ہوتے ہیں۔ ان میں عملی قوتیں ناپید ہوتی ہیں اور دینی نقطۂ نظر سے وہ کسی کام کے نہیں رہتے۔ امتِ مسلمہ کے اندر ان فواحش کا پھیلنا ایک بہت بڑے خطرہ کی علامت ہے۔ یہ مرغِ بادنما ہے جو ایک خطرناک طوفان کا پتہ دیتا ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جن سے ہم پوری طرح واقف ہیں لیکن انہیں جانتے ہوئے آج دنیا کے ہر مسلمان ملک میں انہیں ترقی دینے کے لیے پوری پوری کوششیں کی جا رہی ہیں اور ان میں پیش پیش وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں ملک کی زمامِ کار ہے۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ان فواحش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے پھیلانے کو بھی اسلام ہی کی خدمت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس اندوہناک صورت حال میں ایک عام مسلمان کا دل و دماغ جس حد تک پریشان ہوتا ہے اُس کا اندازہ وہ شخص بڑی آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے جس نے کبھی بھی عام لوگوں سے مل جل کر اُن کے تاثرات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کسی بس سٹاپ پر کھڑے ہو جائیں۔ کسی گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ جائیں، کسی اجتماع میں شریک ہوں تو آپ لوگوں کو اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے پائیں گے۔ وہ خواہ اسلام پر پوری طرح عمل کرنے والے نہ ہوں لیکن اُن کے دل و دماغ، اور احساس و وجدان میں اسلام کا وہی تصور رہتا ہے جو انہیں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملا ہے۔ جب وہ اس تصوّر کی روشنی میں "جدید اسلام" کو دیکھتے ہیں تو وہ سخت مضطرب ہو کر پکار اٹھتے ہیں:

"این نقشِ دیگر است"

مگر ان کے سربراہ انہیں ہر ممکن طریق سے یہ باور کراتے ہیں کہ اسلام درحقیقت یہی ہے، ملّا نے اپنی ذاتی اغراض کے تحت اسے تم سے چھپا رکھا تھا۔ یہ بات کبھی انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔ وہ یہ سمجھ نہیں پاتے کہ آخر رقص و سرود اگر فی الواقع دین کا ایک لازمی جزو ہی ہے تو اسے آج تک اخفا میں رکھنے کی کیا مصلحت تھی اور اس سے ملّا بے چارے کو کونسے فوائد حاصل ہوئے ہیں۔

اس مغرب زدہ طبقہ کی پوری توجہ عرصۂ دراز سے صرف اسی ایک نقطۂ نظر پر مرکوز چلی آرہی ہے کہ کسی طرح مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے درمیان جو حجابات موجود ہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔ یہ لوگ درحقیقت مغربی اقدارِ حیات کے ہی پرستار ہیں لیکن چونکہ ان کی براہِ راست تبلیغ کرنے سے اُن کا اقتدار خطرے میں پڑتا ہے اس لیے وہ انہیں اسلام کا نام لے کر پھیلانا چاہتے ہیں اور جب انہیں کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں جنہیں تم اسلام کے نام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو، اسلام میں موجود نہیں تو وہ فوراً یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اسلام میں تو بڑی وسعت ہے ملّا تم نے اس کا دائرہ خواہ مخواہ تنگ کر دیا ہے۔ ان حضرات کو اسلام کے کسی ایسے جزو پر اعتماد نہیں جس کی تائید مغربی فکر سے نہ ہو سکے۔ اسلام ان کے نزدیک ایک بے بس غلام ہے جس سے جتنا چاہا کام نکال لیا اور جسے جہاں چاہا بڑی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا۔ اس طرزِ فکر کو آپ مسلمانوں کی پوری مغرب زدہ لیڈرشپ کے اندر بڑی آسانی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ہم صرف اُس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

جنرل ناصر جب اپریل میں پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے اسلامی تہذیب اور اس کی روایات کو بڑے اچھے انداز میں سراہا لیکن انہیں خود اسلام پر جو اعتماد ہے اُس کا اندازہ اُس جواب سے کیا جا سکتا ہے جو اُن سے اسلامی بلاک کے سلسلہ میں پوچھا گیا۔ ایک اخباری نمائندہ نے اُن سے کہا کہ کیا آپ ایک مسلم بلاک کی تشکیل کے حق میں ہیں؟ اس پر انہوں نے فرمایا کہ مذہب کو قومی یا بین الاقوامی سیاست کی بنیاد نہیں بنایا سکتا۔ البتہ وہ اس کے حق میں ضرور ہیں کہ مسلم ممالک کے درمیان زیادہ سے زیادہ رابطہ ہو کیونکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ روحانی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔

یہ ہے اس قسم کے حضرات کا اُس دین پر اعتماد جو زندگی کے سارے گوشوں کا احاطہ کرتا ہے، جو فکر و نظر کی انتہائی بلندیوں سے لیکر افعال و اعمال کی معمولی سے معمولی جزئیات تک ہماری نہ صرف رہنمائی کرتا ہے بلکہ انہیں ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے، اور اس طرح ایک مخصوص تہذیب و تمدن کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

دنیا کا ہر تمدن جو اپنے پیشِ نظر ایک انقلابی پروگرام رکھتا ہو وہ اس نیم دلانہ وابستگی کو کبھی بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس کے اندر تخلیقی قوت اُسی وقت تک موجود رہتی ہے جب تک اُس کی اپنی رُوح اُس کے مختلف شعبوں کے اندر جاری و ساری رہے اور جب بھی کسی تمدن میں باہر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسے عناصر شامل کیے گئے جو اُس کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتے تھے اُس وقت وہ تمدن تباہ ہوا۔ اس سلسلے میں یوں تو بہت سے شواہد موجود ہیں لیکن یہاں ہم صرف دو مفکرین کی آراء پیش کر کے بات ختم کرتے ہیں:

"ہر تہذیب اپنے آپ میں ایک وحدت ہوتی ہے، اس کا آرٹ، مذہب، طرزِ رہائش، معاشی اور صنعتی ترقی، یہ سب شعبے ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں مجھے اس امر میں شک ہے کہ کوئی قوم بھی حسبِ منشا تمدن کے عناصر کے اندر انتخاب کرنے میں کامیابی حاصل کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر کیا اہلِ مشرق یہ کہہ سکتے ہیں: ہم مغرب سے صرف اس کے بڑے بڑے جہاز، اس کے کارخانے اور طبی ایجادات تو لیں گے لیکن اُس ذہنی انتشار، اُس برق رفتاری اور اُس تمدنی خلفشار سے بچ نکلیں گے جو مغربی تہذیب کے لازمی تقاضے ہیں؟" (لوئیس ڈکنسن)

حقیقت یہ ہے کہ تہذیب مختلف اجزا میں منقسم نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر دنیائے مغرب کو دوسری دنیا پر جنگی میدان میں جو برتری حاصل ہے اُس کی وجہ وہ اسلحہ اور عسکری تربیت نہیں، جن سے اہلِ مغرب واقف ہیں اور نہ ہی محض صنعتی ترقی کو اس کی علت قرار دیا جا سکتا ہے اسے پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں مغربی سوسائٹی کی روح کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اہلِ مغرب کی جنگی تدابیر ان کے تہذیبی مظاہر ہی کا حصہ ہیں۔ لہٰذا ایک ایسی سوسائٹی جس نے لڑنے کے مغربی طریقوں کو مغربی تہذیب اپنائے بغیر اختیار کرنے کی کوشش کی ہے وہ سخت ناکام ہے۔ ۔ ۔ (آرنلڈ ٹائن بی)

معذرت

پچھلی مرتبہ ماہ اپریل ۱۹۵۶ء کے پرچہ پر غلطی سے مئی ۱۹۵۶ء طبع ہو گیا تھا۔ مئی ۱۹۵۶ء کے پرچہ میں بھی اس کی تصحیح میں فروگذاشت ہو گئی۔ لہٰذا خریدار اور ایجنٹ حضرات درست فرمالیں۔ (مینیجر)

© rasailojaraid.com